© rasailojaraid.com

مولانا رئیس احمد جعفری

مولانا عبد الحلیم شرر ایک مؤرخ کی حیثیت سے

مولانا عبد الحلیم شرر اپنے علم و فضل، ذوقِ تحقیق و تفحص اور مؤرخانہ ژرف نگاہی کے سبب اپنے دور کی اہم ترین شخصیت تھے، حدیث و تفسیر پر اُن کی نظر تھی، علم کلام و اصول، مباحثِ اسلامیہ، فرقِ اسلامیہ اور مذاہبِ اسلامیہ پر ان کی بڑی گہری اور وسیع نگاہ تھی، تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، انھوں نے بے مثل، یادگار اور انتہائی بلند پایہ تاریخی کتابیں لکھیں، تاریخی عنوانات کے انتخاب میں انھوں نے ہمیشہ جدتِ طبع اور تنوع کا مظاہرہ کیا۔ سیر و سوانح پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے وہ اُردو زبان کا نہایت گرانبہا اور قیمتی اثاثہ ہے، وہ پہلے شخص ہیں جس نے اُن مایۂ ناز و صد احترام خواتینِ اسلام کو روشناسِ خلق کرایا جو صرف کتابوں کے اوراق میں مستور تھیں، لیکن جن کے کارنامے، شجاعت اور دلیری کی داستانیں، ایثار و فدویت کی کہانیاں، اسلامیت اور للّٰہیت کے واقعات، حمیتِ دینی، غیرتِ ملّی، اور جذبۂ قومی کے سبق آموز، ولولہ انگیز اور ایمان افروز نمونے داستان پارینہ بن کر ماضی کے پردے میں، اور ماضی کے اندھیرے سے وادئ فنا میں پہنچ چکے تھے، انھوں نے ایسی مسلمان، غیر مسلم اور بین الاقوامی شخصیتوں کو روشناسِ خلق کرایا، جن کا نام تو تکیۂ کلام بنا ہوا تھا لیکن جن کی سیرت، کردار اور کارنامے بردۂ خفا میں مستور تھے، مسلمانوں میں قومی جوش اور جذبہ پیدا کرنے کے لیے چن چن کر انھوں نے ایسے ابطال و اکابر رجال کے حالات و سوانح لکھے، جو تاریخِ انسانیت کا ناقابلِ فراموش اور غیر منفک حصہ بن چکے ہیں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی، اپنے استاد علامہ شبلی مغفور اور اپنے ہم قلم اور ہمعصر، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرح کسی کا علمی پایہ مشکل سے تسلیم کرتے تھے اور داد دینے میں یا حوالہ دینے میں، یا بطور مثال پیش کرنے میں حد درجہ احتیاط اور تامل سے کام لیتے تھے۔ لیکن ان کی زبان سے دو بزرگوں کے پایۂ علم اور پایۂ تحقیق کا اعتراف کرتے مَیں نے بارہا سنا، ایک مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، دوسرے مولانا عبد الحلیم شرر، مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ ۱۹۲۵ء میں جب ان سطروں کا لکھنے والا ایک کم سن، اور ابتدائی درجہ کا طالب علم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا، ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کی زیر صدارت منعقد ہوا، یہ جلسہ کافی عرصہ کے بعد ہوا تھا، اس لیے شرکت کے لیے اطراف و اکناف ہند سے اکابر و مشاہیر رجال تشریف لائے تھے جن میں تیونس کے علامہ ثعلبی، لاہور کے خواجہ کمال الدین، انبالہ کے میر غلام بھیک نیرنگ، امرتسر کے شیخ صادق حسن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اجلاس میں عام تقریروں کے علاوہ ایک نشست تاریخی اور تحقیقی مقالات کی بھی ہوتی تھی جس میں ملک کے منتخب علما اپنے مقالات پڑھتے تھے۔ بعد ازاں وہ روداد سالانہ میں شائع کر دیے جاتے تھے۔ اس مرتبہ جو نشست ہوئی اس میں ایک مقالہ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی پڑھا، مقالہ خاصا طویل تھا، اس کی قرأت کا سلسلہ کم و بیش دو گھنٹے تک جاری رہا، حاضرین محویت کے عالم میں یہ مقالہ سن رہے تھے۔ مولانا شیروانی ذرا اونچا سنتے تھے، وہ بار بار ہاتھ کانوں تک لے جا کر، پوری توجہ سے سننے کی کوشش کرتے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے حضرت الاستاذ سید صاحب کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے تھے، ایک دل آویز تبسم کے ساتھ اسی انداز میں وہ جواب دیتے تھے، نشست جب ختم ہوئی تو سید صاحب نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے مقالے پڑھے تھے، سب سے زیادہ داد انھوں نے مولانا شرر کو دی، اور کافی دیر تک ان کے مقالے کو سراہتے رہے، یہ مقالہ ۱۹۲۵ء کے اجلاس ندوۃ العلما کی روداد میں تمام و کمال شائع ہو چکا ہے۔

مولانا شرر کا تاریخی اور تحقیقی سرمایہ اگرچہ مرورِ ایام کی نذر ہوتا جا رہا ہے لیکن یہ مولانا سے زیادہ علم و فن کی بدقسمتی ہے، انھوں نے دو طویل و ضخیم جلدوں میں تاریخ سندھ لکھی، اس موضوع پر قلم اٹھانا آسان کام نہ تھا، کیونکہ جس زمانے میں مولانا نے یہ کتاب لکھی ہے اصل مصادر اور مراجع بڑی حد تک نایاب تھے، بلاذری کی فتوح البلدان اور دوسری عربی کتابوں میں جو مواد تھا، وہ بھی کمیاب عسیر الحصول اور بکھرا ہوا تھا، الیٹ صاحب نے اپنے سرکاری اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر کئی قلمی اور غیر مطبوعہ نادر نسخوں تک جو تحقیقی مصادر کی نوعیت رکھتے تھے رسائی حاصل کر لی تھی، اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مستند بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ بہرحال حکمران قوم کا ایک فرد تھا، اور وہ کسی حالت میں ان مصالح اور داعیات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا جو اس کے قومی مقتضا سے تعلق رکھتے تھے، مولانا نے اس کی کتاب سے بھی فائدہ اٹھایا، لیکن آنکھ بند کر کے نہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلی رکھ کر، یہ دوسری بات ہے ایک آدھ جگہ انھیں مغالطہ ہوا، جیسا کہ حضرت سید صاحب نے اپنی یگانۂ روزگار کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں سرسری سا اشارہ کیا ہے لیکن غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ قرآن کے سوا کون سی کتاب ہے جس کے بارے میں یہ دعوےٰ کیا جا سکے کہ الف سے ی تک تمام و کمال صحیح ہے؟ دوسرے بڑے مورخین کی طرح اگر مولانا شرر کی تحقیق بھی کہیں محل نظر ہے تو اسے بس اتنی ہی حیثیت دی جائے گی جتنی وہ ہے، مجموعی حیثیت سے مولانا کی کتاب معلومات اور واقعات کا گنجینہ ہے۔ اس کے تقریباً ربع صدی کے بعد مولانا سید ابوظفر ندوی نے بڑی کاوش اور تحقیق سے تاریخ سندھ مرتب کی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے حق ادا کر دیا لیکن یہ چیز بہرحال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ شرر صاحب کو جتنی محنت اپنی کتاب کے لیے مواد فراہم کرنے میں ہوئی سید ابوظفر صاحب کو نہیں ہوئی اس لیے کہ ان کے سامنے کچھ نئے مصادر بھی آ چکے تھے۔

اردو زبان میں دو کتابیں میری نظر میں تحقیق کا اتنا اونچا معیار پیش کرتی ہیں کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہ کتابیں اگر کسی ترقی یافتہ ملک اور ترقی یافتہ زبان میں شایع ہوتیں تو متعدد یونیورسٹیوں کی طرف سے فاضل مصنفین کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں مل گئی ہوتیں۔ نیز قدر افزائی کے دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جاتے، افسوس! ان دونوں کتابوں میں سے ایک کمیاب اور دوسری نایاب ہے شاید کچھ عرصے کے بعد لوگ ان کے نام بھی بھول جائیں۔ جن لوگوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان میں ایک تو حضرت سید صاحب کی کتاب "ارض القرآن" ہے، اور دوسری مولانا شرر کی "تاریخ ارضِ مقدس" دونوں اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتی ہیں، میرا خیال ہے بلکہ دعوےٰ ہے کہ عربی زبان میں بھی اس موضوع پر اتنا اچھا اور مستند مواد کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں مل سکتا۔

مولانا شرر، ایک مورخ، اور صحافی کی حیثیت سے اپنے معاصرین پر یک گونہ فوقیت رکھتے ہیں، فوقیت اس اعتبار سے ہے کہ کوئی پارٹی یا جماعت نہ رکھنے، اور کسی پارٹی یا جماعت سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود اظہارِ خیال میں حد درجہ جری، بیباک اور نڈر تھے، اس کی قطعاً پروا انہیں کرتے تھے کہ خود ان کے گروہ ــــ علمائے کرام ــــ پر اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ عوام کے جذبات و تاثرات کی کیفیت کیا ہوگی؟ اور اصحاب اقتدار و اختیار اسے کس نظر سے دیکھیں گے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا نے ایک ہفتے وار سیاسی اخبار "مہذب" نکالا، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان سرسیّد کی ڈگر سے ہٹنے لگے تھے، اور سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھنے کی ذہنیت ترک کر چکے تھے، ان میں سے اکثر ـــــ جاگیرداروں، تعلقداروں اور پنشن یافتہ سرکاری ملازمین کے سوا ـــ جارحانہ قومیت کی طرف مائل ہو چکے تھے، کانگرس ان کے لیے نشانِ منزل کا کام دے رہی تھی، غیر مشروط ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے، اور لفظاً نہ سہی، عملاً قومیت متحدہ کے علمبردار تھے، لکھنؤ میں اس جماعت کے سرخیل سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ تھے، مخالف کے لیے، یا جس کی مخالفت پر اتر آئیں قضائے مبرم کی حیثیت رکھتے تھے، ایسے مواقع پر جب لکھنے بیٹھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا، قلم میں نب کی بجائے بچھو کا ڈنک لگا یا ہے، اور دوات میں روشنائی کی جگہ سانپ کا زہر بھر دیا ہے، مولانا حالی جیسے ثقہ بزرگ تک پر کاری وار کرنے سے باز نہیں آئے! مولانا شرر کا "مہذب"، سجاد حسین کی پالیسی سے یکسر متضاد تھا، وہ کانگرس پر ہندوؤں پر، ان دونوں کی سوچی سمجھی مشترک پالیسی پر سختی کے ساتھ اعتراض کرتا تھا۔ انھوں نے ہندوؤں سے دیرینہ ذاتی تعلقات کو، ملّی اور قومی مفاد کے راستے میں کبھی حائل نہیں ہونے دیا۔ ان کے مضامین میں زور بھی تھا، دلیل بھی، اور وزن بھی، اگر مرنجاں مرنج پالیسی اختیار کرتے تو فائدے میں رہتے تھے، اور اگر وقت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے قومیتِ متحدہ کے ایوان میں پہنچ جاتے تو نوازے جاتے، لیکن انھوں نے ان میں سے کوئی راستہ بھی نہیں اختیار کیا، دفاعِ ملی میں سرگرم رہے، قومی مطالبات پیش کرتے رہے، اور معتوب و مقہور ہوتے چلے گئے۔

لکھنؤ میں "مہذب" کا وجود اودھ پنچ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا

چنانچہ سجاد حسین نے ان کے خلاف مورچہ سنبھال لیا، اور خیابانِ مہذب پر آگ برسانی شروع کر دی۔ ان کے تمام ساتھیوں نے بھی آتش ریزی میں کمی نہیں کی، اور ساتھیوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی، ہندو اخبارات اور صحائف نے، نیز ہندو مفکروں اور سیاست دانوں نے دل کھول کر اودھ پنچ کا ساتھ دیا، اور مہذب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی، لیکن جب تک "مہذب" زندہ رہا، بے خوف لومۃ لائم، مولانا دل کی بات صفحۂ قرطاس پہ منتقل کرتے رہے۔ اودھ پنچ میں ایک خوبی یا بُرائی یہ بھی تھی کہ مخالفت کرتے وقت اصل مسئلہ سے زیادہ مخالف کی شخصیت اور ذات کو زیر بحث لاتا تھا۔ یہی سلوک مولانا کے ساتھ بھی ہوا، کون کون سے ان کے عیب نہ کھولے گئے، لیکن وہ ان سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتوں سے بے پروا، اپنے کام میں لگے رہے، انھوں نے "مہذب" کی لاج رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یعنی دائرۂ تہذیب و متانت سے حتی الامکان قدم باہر نہیں نکالا، لیکن اودھ پنچ اس ادارے کا قائل ہی نہیں تھا لہٰذا اس پر قدم باہر نکالنے کا الزام بھی عائد نہیں کیا جاسکتا۔ "مہذب" زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہا، لیکن اس نے سنجیدہ صحافت اور متوازن تنقید و احتساب کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا، اور شاید یہ اسی کی صدائے بازگشت تھی کہ مولانا محمد علی مرحوم نے جب دہلی سے روزنامہ ہمدرد نکالنے کا فیصلہ کیا تو ان کی نگاہِ انتخاب سب ایڈیٹری کے لیے مولانا شرر پر پڑی اور "ہمدرد" کی اشاعت سے کئی ماہ پہلے وہ اپنے منصب پر فائز کردیے گئے، اور دہلی تشریف لے آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض خانگی اور ذاتی اسباب سے وہ دہلی میں زیادہ عرصے تک نہیں ٹھہر سکے اور لکھنؤ واپس چلے گئے۔

مولانا کی دلیری اور جرأت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں پردہ شکنی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مولانا نے پردے کے خلاف آواز بلند کی، اور اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا۔ کفر کے فتوے، سب و شتم، لعنت و ملامت حد درجہ رکیک و سخیف قسم کے ذاتی حملے، یہ سب چیزیں ایک طوفانِ بلا کی طرح مولانا کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں، لیکن وہ اپنے مسلک پر قائم رہے، اس سے منحرف ہونے کا خیال ہی ان کے دل میں نہیں آیا، جو دوست گلُ پاشی کیا کرتے تھے انھوں نے سنگ باری شروع کردی۔ یہ وار بھی مسکرا مسکرا کر سہہ گئے، نہ حرفِ شکایت زبان پر آیا، نہ پسپائی اختیار کرنے پر تیار ہوئے۔

کوئی ملک جب مٹتا ہے، یا کوئی تہذیب جب دم توڑتی ہے تو سب سے پہلے شعرا سینہ کوبی کرتے اور صفِ ماتم بچھاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نوحہ گری دلوں کی دنیا میں ہلچل مچا دیتی ہے۔ غرناطہ جب مٹا تو "ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی"۔ دِلّی پہ تباہی آئی تو "داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر" صقلیہ (سسلی) یعنی تہذیب حجازی کے مزار پر جب اقبال کی نظر پڑی تو اسے وہ مجاہد یاد آگئے۔

"بجلیوں کا آشیانہ جن کی تلواروں میں تھا"

شعرا کے بعد مورخوں کا قافلہ آگے بڑھتا ہے، اور وہ تہذیبِ رفتہ کے آثار و نقوش اس طرح قلمبند کردیتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے مرقع پھر جاتا ہے، بغداد کی شوکت و عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اور اس کی تہذیب و تمدن کا جلال و جمال داستانِ کہن کی صورت اختیار کر چکا ہے لیکن جب تک خطیبِ بغدادی کی تاریخ بغداد زندہ ہے بغداد مر نہیں سکتا، اس کی تہذیب و تمدن، معاشرت، تعمیر، قصور و محلات، پیوندِ زمین ہو چکنے کے باوجود زندہ ہیں، اندلس کی عظمت مدت کی دم توڑ چکی ہے وہاں علم و ادب کی جو دنیا آباد تھی اجڑ چکی ہے، فنون و حکم کی جو خانقاہیں تھیں ان کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے، فلک پیما، اور جنت نگاہ قصور و محلات کا نام و نشان بھی نہیں رہا، لیکن جب تک نفح الطیب وغیرہ کے اوراق صحیح سلامت ہیں، مٹ چکنے کے باوجود یہ سب زندہ ہیں۔ دہلی کو مرہٹوں نے، جاٹوں نے، نادر شاہ درانی نے اور آخر آخر میں انگریزوں نے جس طرح کند چھری سے ذبح کیا، وہاں کی عمارتوں کو ڈھایا، مکانوں کو مسمار کیا، محلات، قصور پر ہل چلا دیئے محلے کے محلے چٹیل میدان بنا دیئے، مسجدوں، خانقاہوں اور مزارات پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، ہر چیز کو خاک میں ملا دیا۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے بشیر احمد کی معرکۃ آلآرا کتاب تاریخ دار الحکومت دہلی جب تک موجود ہے کون کہہ سکتا ہے کہ دہلی مٹ گئی؟ زمین پر نہ سہی اوراقِ تاریخ پر وہ موجود ہے اور اسی شان جمال کے ساتھ موجود ہے جو اس کی خصوصیت تھی۔

لکھنؤ بھی مٹا، اس پر بھی تباہی آئی، اس کی تہذیب بھی فنا ہو گئی، اس کے آثار و نقوش بھی روند روند کر کچل دیئے گئے۔ لکھنؤ کے ساتھ زیادہ تشدد اس لیے برتا گیا کہ دہلی پر انگریزوں کے قابض ہو جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک لکھنؤ کے جیالے اور حریت مآب مرنے اور مٹنے کے لیے لڑتے رہے، انگریزوں نے بہادر شاہ کو گرفتار کیا۔ ان پر مقدمہ چلایا اور سزا بھی دی لیکن سعی بسیار کے باوجود وہ حضرت محل کو نہ گرفتار کر سکے نہ ان پر مقدمہ چلا سکے نہ سزا دے سکے۔ ترغیب و تحریص کے باوجود انھیں اسیرِ دام نہ کر سکے، جتنے جید، اور یگانہ روزگار علما نے لکھنؤ کی جنگِ آزادی میں جہاد باللسان سے دستبردار ہو کر جہاد بالسیف کیا، اس کی مثال سارے ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی "حبس دوام بہ عبور دریائے شور" کی سزا پانے والے انڈیمان کے قیدیوں کی اگر فہرست تیار کی جائے، تو سلطنت اودھ کے مجاہدین حریت کا پلہ دوسروں کے مقابلے میں بھاری نظر آئے گا۔

مجاہدینِ لکھنؤ نے جو کاری گھاؤ فرنگی استعمار کے حلقوم و گلو اور دل و جگر پر لگائے، بلاشبہ وہ ناقابلِ فراموش بھی تھے، اور ناقابلِ عفو بھی، لہٰذا لکھنؤ اس کے تمدن، اس کی تہذیب، اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آثار و مظاہر کو جس بے دردی سے انگریزوں نے مٹانے کی کوشش کی وہ کہیں اور نظر نہیں آتی، دلّی کے دیہاتوں کا یہ حال تھا کہ وہاں سے شہزادے اور شہزادیاں بھی صحیح سلامت نہیں جا سکتی تھیں، پناہ دینے کا کیا سوال، دیہاتی گرفتار کر کے انھیں حوالۂ سرکار کر کے دام کھرے کر لیتے تھے۔ لکھنؤ میں یہ حال تھا کہ دُور دراز دیہاتوں تک میں خاندانِ شاہی کے افراد کا کیا ذکر، ہر سپاہی اور مجاہد کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے جاتے تھے۔ لشکرِ مجاہدین کے لیے، زر نقد اور غلّہ، جتنا بھی ممکن ہو سکتا نذر کر دیا جاتا تھا، اور وہاں کے منچلے "دشمن" سے لڑنے کے لیے فوجی دستوں کے ساتھ ہو جاتے تھے۔

قیصر التواریخ کا مصنف انگریزوں کا ملازم بھی تھا اور مداح و ثنا خواں بھی اس کی کتاب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انگریزوں نے زیادہ منتقمانہ جوش کے ساتھ لکھنؤ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی، دلّی کی فتح میں بھی سکھ راجوں مہاراجوں کا حصّہ تھا لیکن اتنا نہیں کہ انھیں بڑی بڑی جاگیریں انعام میں دی جاتیں، لیکن لکھنؤ میں ایسا ہوا، بھرائچ وغیرہ میں تقسیم ہند تک یہ جاگیریں موجود تھیں اور سونا اگل رہی تھیں۔

اس لکھنؤ کی تہذیب، تمدّن، معاشرت، فنون، علوم، محلّات و قصور، مزدوروں اور فنکاروں کی تاریخ مولانا شرر نے "گذشتہ لکھنؤ" یا "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے لکھی، اور سب سے بازی لے گئے۔ یہ مبالغہ نہیں اظہارِ واقعہ ہے، دلّی اور لکھنؤ اور وہاں کے صنائع بدائع پر انگریزوں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور درد دل کے ساتھ لکھا ہے تحقیق اور کاوش کے ساتھ لکھا ہے لیکن جزئیات تک وہ استقصا کہیں نظر نہیں آتا جو شرر کی کتاب میں نظر آتا ہے، جس کاوش اور تحقیق و جستجو کے ساتھ انھوں نے مواد فراہم کیا ہے، اسے ترتیب دیا ہے اور با ایں ہمہ بے ہمہ طور پر داستان بیان کی ہے اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے، قلم مورّخ کا ہے، زبان نوحہ گر کی، ان دونوں نے مل کر کتاب کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔

مولانا شرر کا ایک اور بہت بڑا اور وقیع کارنامہ ——— جس سے بعد میں بعض ادیبوں اور انشا پردازوں نے پورا پورا استفادہ کیا ——— یہ ہے کہ انھوں نے کتاب الاغانی کے اصل حُسن سے، اردو داں طبقے کو روشناس کرایا، یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اگرچہ عہدِ جدید کے بعض مورّخ بے تکلفی کے ساتھ اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ اس حسین و جمیل تہذیب، تمدن، معاشرت، فنون و علوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی سرپرستی کی اور خاص طور پر نغمہ و سرود کے فن میں مسلمانوں کی ایجادات، اور اس ضمن میں مسلمانوں کے عہد نشاط و طرب کی کہانی ہے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی اور آخری چیز ہے۔ اسے اگر انسائیکلو پیڈیا قرار دیا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا کے زمانے میں اس کتاب کے خلاصے شائع نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں مصر سے اس کے متعدد خلاصے بھی شایع ہوئے۔ ان خلاصوں سے استفادہ کرنا بہت آسان ہے لیکن اصل کتاب سے بہت مشکل۔ خلاصے میں یہ سہولت ہے کہ تلخیص کرنے والے نے جو حصص دلچسپ اور مناسب سمجھے انھیں مختصر کرکے لے لیا۔ ظاہر ہے ہر شخص کا الگ نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ ذوق و مذاق میں بھی یکسانیت نہیں ہوتی۔ لیکن ان خلاصوں سے استفادہ کرنے والا خلاصے کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا، لیکن جس کے پیشِ نظر طلسم ہوش رُبا کے سے طویل و ضخیم مجلدات ہوں اور وہ ان کے ایک ایک صفحے کا امعان نظر سے مطالعہ کرے اور اس بحرِ ناپیدا کنار سے ڈُربائے آبدار چُن کر لائے اس کی بات ہی دوسری ہے۔ مولانا نے یہی کیا، ان کے عدد درجہ دلچسپ نیم تاریخی مقالات و مضامین اغانی ہی سے ماخوذ ہیں۔ مولانا نیاز فتحپوری میرے بزرگ تھے، مَیں ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہا۔ لیکن مَیں ان کے ساتھ ناانصافی نہ کروں گا۔ اگر یہ کہوں کہ ان کے ادبیات عالیہ اور استفسارات کے سلسلے میں اعلام و اسماء کا بڑی حد تک دارومدار اغانی ہی پر ہے اور غالباً اغانی کے خلاصے پر، کیونکہ ان کے ہاں وہ وسعت نہیں نظر آتی جو شرر کے ہاں نظر آتی ہے، نہ اتنی جامعیت ہے جتنی شرر کے ہاں ہے۔ اغانی سے اُردو زبان میں جو چیزیں شرر نے منتقل کی ہیں وہ اپنی اہمیت، جاذبیت اور افادیت کے اعتبار سے یکتا ہیں، انھوں نے اخلاق سوز اور کردار و سیرت پر غلط اثر ڈالنے والی چیزیں نہیں لی ہیں صرف انھیں چیزوں کو اپنی زبان میں لیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ولولہ انگیز یا قومی جذبے کو ابھارنے والی ہیں۔

مولانا شرر کو اپنے معاصرین کرام پر ایک اور حیثیت سے بھی یک گونہ تفوق حاصل ہے، یعنی مولانا انگریزی اچھی خاصی جانتے تھے، وہ یورپ گئے تھے، اور وہاں سال ڈیڑھ سال تک قیام کیا تھا۔ قیام لندن کے دوران میں انھوں نے منصبی ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر باقی وقت تحقیق و مطالعے ہی میں گذارا، اگرچہ امر واقعہ یہ ہے کہ انھیں زیادہ وقت نہیں ملا، پھر بھی انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے وہاں رہ کر انگریزی زبان کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا، انھوں نے انگریزی ادب سے بھی اغانی کی طرح نہایت دلچسپ اور سبق آموز مواد حاصل کیا، اور یہ سلسلہ زندگی کی آخری سانس تک جاری رکھا۔ سیر رجال و مشاہیر کے سلسلے میں انھوں نے جو بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے، یونانی دیو مالا سے متعلق جو کچھ انگریزی زبان میں ہے مولانا نے اس کا بھی بامعانِ نظر مطالعہ کیا تھا، اور کام کی چیزیں اپنی زبان میں منتقل کر لی تھیں، مشاہیر و اکابر کے احوال و سوانح کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے صرف مشاہیرِ اسلام تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا دامن مشاہیرِ عالم تک وسیع کر دیا ہے۔ یہی کیفیت ان کے تاریخی اور جغرافی مضامین کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ دانوں کے متعلق بھی انھوں نے جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے وہ اپنے وقت میں یقیناً نادر اور حد درجہ اچھوتا مواد تھا۔

خواتینِ اسلام اور خواتینِ عالم پر بھی انھوں نے جو لٹریچر دیا ہے وہ آج بھی اتنا ہی کار آمد ہے جتنا خود ان کے زمانے میں تھا، بلکہ شاید اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے اس لیے کہ اپنے ماضی سے اور ماضی کے اصحاب و اکابر سے آج ہم جتنے ناواقف ہیں کل نہ تھے۔

ایامِ عرب کے نام سے دو جلدوں میں مولانا نے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ان ہولناک قبائلی جنگوں کو بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے جن کا اچٹتا ذکر مولانا حالی نے اپنے مسدس مدّ و جزرِ اسلام میں کیا ہے "یعنی کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا ——— اور کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا" اور یہ ان کا جھگڑا جب شروع ہوتا تھا تو نسلوں جاری رہتا تھا۔ اس کا مواد بھی مولانا نے زیادہ تر اغانی سے لیا ہے لیکن صرف اس پر انحصار نہیں کیا ہے۔

عرب جاہلیت کی ثقافت اور معاشرت کو بھی علمی طور پر مولانا شرر نے متعدد مواقع پر اپنا موضوع بنایا ہے، اور کوئی شبہ نہیں، اس سلسلے میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ معنویت اور خوبی کے اعتبار سے اس مواد سے کہیں زیادہ فکر آفرین ہے جتنا ان حضرات کا لٹریچر جو عرب جاہلیت سے بالواسطہ طور پر عربی نہ جاننے، یا اچھی طرح نہ جاننے کے باعث واقف ہیں، اور تعلّی کا یہ عالم ہے کہ قرآن کو اس کے ذریعہ سمجھنے سے زیادہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں ——— شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد ؟

سوق عکاظ، عرب جاہلیت کا سب سے بڑا تہذیبی اور ثقافتی میلہ ہوا کرتا تھا، مولانا نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی تصویر کشی متعدد مواقع پر نہایت دلچسپ اور دل نشین انداز میں کی ہے۔ کہنا چاہیے تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

حال میں مولانا پر نظرِ عنایت یوں مبذول کی گئی ہے کہ بجائے اس کے کہ اُن کی اہم اور معرکۃ الآرا تحریریں ایڈٹ کر کے شائع کی جاتیں۔ ان پر ضروری حواشی اور نوٹ لکھے جاتے۔ ان کے چند ناول شایع کر دیے گئے ہیں جو تاریخی ناول شایع کیے گئے ہیں ان کے بارے میں بڑی روانی اور سادگی کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ یہ تاریخی نہیں تھے۔

مولانا کے تاریخی ناولوں میں فلورا فلورنڈا، پوپ ایگینس، ملک العزیز ورجنا وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں۔

مولانا کے تاریخی ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقصدی ہوتے تھے، بلکہ اگر انھیں تبلیغی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ عیسائیت کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ پر جو زد انھوں نے یہ تاریخی ناول لکھ کر لگائی ہے، اسے کوئی عیسائیوں کے دل و جگر سے پوچھے، بڑے بڑے مناظروں میں شکست فاش سے بھی انھیں اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا ان ناولوں سے، ان ناولوں میں جتنا کچھ تاریخی حصّہ ہے وہ قطعاً تاریخی ہے۔ اسے گپ کہنا تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے، ہر چیز جو تاریخ میں ہوتی ہے ہر شخص اور ہر طبقے کے لیے یکساں قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے کوئی تاریخ بھی ردّ و کد اور تنقید و احتساب کی زد سے نہیں بچی ہے، اس کی تائید اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے لیکن اسے غیر تاریخی، یا محض افسانہ قرار دے دینا یقیناً زیادتی ہے، اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ زیادتی زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے جو عہدِ جدید کے یکسر غیر تاریخی، تاریخی ناولوں پر یا تو سکوت سخن شناس سے کام لیتے ہیں یا مدحت طرازی کو شیوہ بنا لیتے ہیں۔

فلورا فلورنڈا میں عیسائیوں کے رازِ درون پردہ کی جو پردہ دری کی ہے اور اُن کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں انھیں میں بھی افسانہ ہی سمجھا کرتا تھا لیکن تاریخِ اسپین کے قدیم ترین مآخذ افتتاح الاندلس کا جب میں نے مطالعہ کیا تو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ تو بڑی حد تک تاریخ ہی ہے، پھر اس نقطۂ نظر سے ان کے دوسرے ناولوں کا میں نے مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ زیبِ داستان والے واقعات کو چھوڑ کر جہاں تک مولانا نے جو تاریخ پیش کی ہے، وہ بڑی حد تک صحیح ہے، فلورا فلورنڈا پڑھ کر مجھے اپنے بچپن کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک واقعہ یاد آیا ایک انگریز لیڈی جو تبلیغی مشن سے وابستہ تھیں، ہمارے ہاں ایک خاتون کو بظاہر انگریزی پڑھانے اور درحقیقت دین عیسوی کی تبلیغ کرنے تشریف لایا کرتی تھیں، لیکن بے چاری کو افسوسناک ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا، کیونکہ یہ خاتون فلورا فلورنڈا اور پوپ ایگنیس وغیرہ کے بل پر جو مناظرانہ اعتراضات کرتی تھیں ان کا کوئی جواب موصوفہ کے پاس نہیں تھا، شاید اسی ناکامی کے غم میں انھوں نے سیتاپور کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے شادی کرلی۔

تنقید کے لیے علم کی، مطالعہ کی، ادراک کی، توازن کی، متعلقہ موضوع کے قدیم و جدید لٹریچر سے واقفیت تام اور سب سے بڑھ کر عالی حوصلگی، نیز جذبات اور ذاتی تاثرات و داعیات سے کنارہ کش ہو کر زیر تنقید موضوع کو صرف اور محض اس کے حسن و قبح کی بنا پر جانچنے اور پرکھنے کا ملکہ حاصل کرلینا بہت ضروری ہے، بدقسمتی سے اردو ادب نے جو عظیم نقاد پیدا کیے ہیں، وہ الا ماشاءاللہ ان صفات سے عاری ہیں، وہ قلم سے شمشیر و سناں کا کام لیتے ہیں۔ ان کی بزمِ تنقید حقیقی معنوں میں انجمن ستائش باہمی بن کر رہ گئی ہے۔ گذشتہ ۲۵-۲۶ سال کے تنقیدی لٹریچر کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں اور عریاں ہو کر نظر کے سامنے آجائے گی۔

اس جدید رجحان تنقید کے ہدف اگر صرف معاصرین بنتے تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن اکابر و مشاہیر کی گردن بھی اس خنجرِ بے داد سے محفوظ نہ رہ سکی، مولانا عبدالحلیم شرر پر، اور ان کے تاریخی ناولوں پر جو تنقیدیں ہمارے نقادوں نے کی ہیں انھیں دیکھ کر "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کی صدا لگانے کو جی چاہتا ہے۔ ان حضرات نے تاریخ پڑھے بغیر محض اپنے حُسنِ ظن سے کام لے کر مولانا کے تاریخی ناولوں کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ یہ قطعاً تاریخی نہیں ہیں اور تاریخ بغیر پڑھے موجودہ دَور کے بعض تاریخی ناول نویسوں کے سامنے مرعوب و مجبور ہو کر سپر ڈال دی، اور یہ تسلیم کرلیا کہ وہ سراسر تاریخی ہیں ——— عجمی خم ہے تو کیا "حجازی" ہے مری۔

یہ مولانا پر نہیں اردو لٹریچر اور علم پر بہت بڑا ظلم ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے تاریخی ناولوں میں جو تاریخی مواد پیش کیا ہے وہ قطعاً تاریخی ہے۔

مولانا کے لیے زیبا یہی تھا کہ وہ ناول نویسی کی طرف توجہ نہ مبذول کرتے لیکن ان کا تبلیغی جذبہ انھیں مجبور کرتا رہا کہ اپنی ذہنی توانائی کا بڑا حصہ اس پر صرف کردیں۔

پھر ایک بات اور بھی تھی مولانا کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان کی ناول نویسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے یگانہ علم وفضل کو مجروح کرسکتی ہے، ان کے علم میں عربی زبان کے ایسے بے ہمتا لوگ موجود تھے جو تفسیر، حدیث، کلام، اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، اور دیگر مذہبی علوم میں مہارت تامہ کے ساتھ ساتھ افسانہ وقصص اور نغمہ وموسیقی کی دنیا میں بھی امام اور موجد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ایک حیثیت دوسری حیثیت پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتی تھی شاید ان کا خیال تھا افسانہ وقصص کے ساتھ ساتھ وہ اپنی دستارِ فضیلت بھی سنبھالے رہیں گے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ان کے علم وفضل کو لوگوں نے مانا جانا، مگر بھول گئے، ان کے افسانہ وقصص کو پڑھا، اور اسے تنقید کی کند چھری سے ذبح کر دیا۔

لیکن ان مساعی نافرجام کے باوجود مولانا کا علم وفضل زندہ ہے۔ انھوں نے جو علمی، تاریخی اور مذہبی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب لوگ ان کے ناولوں کو بھول جائیں گے، اور ان کے فضل وکمال کو یاد رکھیں گے، گو ان کے ناول بھی بھلا دینے کی چیز نہیں۔

آخر میں مولانا کی ایک اور معرکہ آرا کتاب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں

صلیبی جنگوں کے متعلق عربی اور انگریزی کی مختلف کتابوں میں بہت کافی مواد بکھرا ہوا ہے۔ اس موضوع پر مستقل بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جو زیادہ تر مختصر ہیں اور ان میں جامعیت کی بھی کمی ہے۔ البتہ لین پول کی کتاب خاصی طویل ہے لیکن ان سب کتابوں میں واقعات وحقائق کی بجائے داستانوں اور افسانوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ صلیبی جنگوں میں شکست کھا کر یا پیٹ کر جن لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی تھی، انھوں نے کچھ اپنے فرار کی لاج رکھنے کے لیے، اور کچھ اپنی قوم میں حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ذہنی اپج سے زیادہ کام لیا۔ حقیقت نگاری کی وادی میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اب امریکہ کو بھی اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ حال میں متعدد کتابیں مختلف مصنفین کی اس موضوع پر شائع ہوئی ہیں حیرت ہے کہ اتنی مدت گذر چکنے کے باوجود انھوں نے حقیقت نگاری کو موردِ التفات نہیں قرار دیا۔ اور افسانہ طرازی ہی کو شعار بنائے رکھا۔ ان کتابوں میں ناول کی دلچسپی تو ہے لیکن تحقیق وتنقید اور کتب حوالہ کی طرف متوجہ ہونے کی ذرا بھی زحمت نہیں کی گئی ہے۔

ایک بات جو بے اندیشۂ تردید عرض کر سکتا ہوں یہ ہے کہ مولانا شرر کی "تاریخ حروب صلیبیہ" اپنے موضوع پر اب تک اچھوتی اور سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ انھوں نے عربی، انگریزی، فرنچ وغیرہ کے ماخذوں کو بڑی ژرف نگاہی سے کھنگالا ہے اور انتہائی عرق ریزی سے اس مواد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو تنقید کی کسوٹی پر کسا بھی ہے۔ اس انتہائی اہم اور ضروری موضوع پر کسی ایک کتاب میں اتنا مستند اور سنہرا ذخیرہ قطعاً نہیں مل سکتا۔ یہ کتاب لکھ کر مولانا نے تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں مسلمانوں کی شجاعت، دلیری، جرأت وہمت، ایثار و فدویت، جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کی نہایت روح پرور مثالیں نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انگلستان، آسٹریا، جرمنی، فرانس، روم اور دیگر مغربی ممالک کے مجاہدین صلیب کے ساتھ بھی کوئی ناانصافی نہیں کی ہے اور ان کا مرقع بھی سچائی اور صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو تصویر قبیح تھی اسے وہ حسین نہیں بنا سکتے تھے، اور جو حسین تھی اسے قبیح بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مولانا شرر جیسے جذباتی اور مخالفِ عیسائیت مؤرخ کا یہ بڑا وقیع کارنامہ ہے۔ بدقسمتی سے ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب اب کبریتِ احمر کا حکم رکھتی ہے اور بالکل نایاب ہوچکی ہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام اور رواداری

قرآن کریم اور حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے اور انسانیت کے بنیادی حقوق ان کے لیے کس طرح اعتقاداً اور عملاً محفوظ کیے ہیں۔

قیمت حصہ اوّل: ۷٫۲۵ روپے، حصہ دوم ۷٫۵۰ روپے۔

سیاستِ شرعیہ

اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے ایک دستورِ حیات پیش کیا تھا، جو منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ سیاستِ شرعیہ میں قرآن، حدیث، آثار اور روایاتِ صحیحہ کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔

قیمت : ۵ روپے

پتہ: سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com